OPEN ACCESS
Al-Qamar
ISSN (Online): 2664-4398
ISSN (Print): 2664-438X
www.alqamarjournal.com

اسلامی کلچر سے متعلق مباحث میں سلیم احمد پر محمد حسن عسکری کے اثرات

(*Muhammad Hassan Askarī's* Impact on *Saleem Ahmed* in Discussions on Islamic Culture)

Ghulam Abbas
Doctoral Candidate Urdu, AIOU, Islamabad/Lecturer Urdu, Govt. Graduate College Taunsa

Dr. Syed Hamid Farooq Bukhari
Lecturer in Islamic Studies, University of Gujrat, Gujrat

Dr. Sami Ullah
Assistant Professor of Arabic, University of Education, Lahore

Abstract

Muhammad Hassan Askarī (1919-1978), a well-known Pakistani literary critic, scholar and author, had a profound effect on many Pakistani writers. The present article explores *Askarī's* Impact on *Saleem Ahmed* (1927-1987), a prominent Pakistani author, poet and one of the few finest literary critics of Urdu criticism. The study maintains that *Ahmad* due to *Askarī*'s influence, even being a registered member of progressive school of thought, criticized progressive writers throughout his life in his discussions on Islamic culture. He followed *Askarī*'s traditions in its letter and spirit. He looks a fan of *Ibn Arabī* and Rene Guenon. He is a critic of modernism of *Sir Syed Ahmad Khān* and *Hālī*. Like *Askarī,* he is in favor of Indo Islamic culture in Pakistan. Ahmad along with imitating and promulgating *Askari's* tradition also maintained and developed his own individuality in style and ideas. He also believes in literature for the sake of literature in which real life depicts.

Key words: *Saleem Ahmad*, impact, *Hassan Askarī*, Islamic Culture, Pakistan, criticism

CC BY

تمہید

اردو ادب اور ادبی تنقید میں محمد حسن عسکری (1919ء-1978ء) ایک منفرد اور موثر شخصیت ہیں۔ انھوں نے مغرب اور مغربی لٹریچر کا بھرپور مطالعہ کیا۔ ابتدا میں مغربیت پسند رہے، لیکن بالآخر مغرب پر تنقید کی طرف آ گئے، اور ہندی اسلامی کلچر پر زور دینے لگے۔ بہترین مغربی ادب شناس ہونے کے ناتے عسکری کی تنقید مغرب پر روایتی ادبی یا مذہبی حلقوں کی تنقید سے نہایت گہری اور پر اثر ہے۔ آپ کی تنقید کے کی گہرائی اور گیرائی کو آپ کے ناقدین نے بھی تسلیم کیا ہے۔[1] اس مضمون میں ہمارے پیش نظر اسلامی کلچر کے مباحث سے متعلق معروف ادیب، شاعر اور نقاد سلیم احمد (1927ء-1987ء)[2] پر محمد حسن عسکری کے اثرات کا مطالعہ ہے۔ اس میں یہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے کہ مذکورہ تناظر میں محمد حسن عسکری کے حوالے سے سلیم احمد کے اپنے جذبات و احساسات کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی تنقیدی تحریروں سے ان پر عسکری صاحب کے اثرات کا کھوج لگایا گیا ہے اور آخر میں خلاصۂ بحث پیش کیا گیا ہے۔

محمد حسن عسکری کے اثرات سے متعلق سلیم احمد کے اپنے جذبات و احساسات

سلیم احمد کے مطابق ان کی تربیت میں ماں کے علاوہ دو شخصیتوں کا بڑا اہم کردار ہے: ایک ان کے استاد کرار حسین صاحب اور دوسرے استاد پروفیسر محمد حسن عسکری ۔ پہلے کو وہ اپنا آئیڈیل مانتے ہیں، اور اقرار کرتے ہیں کہ ان کے خیالات و نظریات پر ان کی سیرت کا گہرا اثر ہے۔ اور دوسرے کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ میرے چاروں طرف اندھیرا ہو تو عسکری میرا روشن چراغ ہیں۔ میں زخم کھا کر بھاگتا ہوں تو انھی کی طرف کہ وہ میرے ہر زخم کا مرہم ہیں۔ میں مایوس ہو کر پلٹتا ہوں تو انھی کی طرف کہ وہ میری امید ہیں، میری روح کا آسرا ہیں۔ اپنی طویل نظم "مشرق" میں وہ ان سے اپنی والہانہ عقیدت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

یہ صاحب وہ ہیں جن کی اک ضرب کاری
قلم کے ہزاروں حریفوں پہ بھاری
غلامی میں ان کی کٹی عمر ساری
وہ میرے صنم ہیں میں ان کا پجاری
وہ گر مو قلم ہیں تو تصویر ہوں میں
انھی کی لکھی ایک تحریر ہوں میں [3]

---

[1] دیکھیے: نعیم طاہر، محمد حسن عسکری اور جدید ادبی شعور (مقالہ پی ایچ ڈی، جسی ہونی ورسٹی لاہور)، 498۔

[2] عسکری صاحب کی محبت اور عقیدت سے مملو سلیم احمد، اردو کے ان گنے چنے چند نقادوں میں سے ایک ہیں، جن کے پاس اپنی ایک فکر اور اپنی ایک نظر ہے، بہ قول نظیر صدیقی صاحب کہ سلیم کے ذہن اور ذوق کی تشکیل میں عسکری ایک بڑے اثر کی حیثیت تو ضرور رکھتے ہیں مگر ان کی تحریریں عسکری کے چبائے ہوئے نوالے نہیں۔ سلیم احمد کی تصنیفات و تحریرات میں ادبی اقدار، نئی نظم اور پورا آدمی، غالب کون، ادھوری جدیدیت، اقبال: ایک شاعر، محمد حسن عسکری: انسان یا آدمی، اسلامی نظام: مسائل اور تجزیے، بیاض، چراغِ نیم شب، اکائی وغیرہ شامل ہیں۔

[3] جمال پانی پتی، مضامین سلیم احمد (کراچی: اکادمی ادبیات، 2009ء)، 12-13۔

سلیم احمد کو کو یہ احساس ہے کہ عسکری صاحب پر اگر وہ کچھ لکھتے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ عسکری صاحب نے ان جیسے چھوٹے آدمی کو بھی وہ خود اعتمادی عطا کر دی ، جس کے بغیر کچھ لکھنا تو کیا زندہ رہنا بھی مشکل تھا۔ یہ بھی درست ہے کہ جب سلیم احمد نے "حریت" میں اپنا کالم "جھلکیاں" کے عنوان سے شروع کیا تو اعتراض ہوا کہ یہ عنوان تو عسکری کا ہے جس پر سلیم احمد نے جواب دیا تھا کہ ایک عنوان ہی کیا میرا تو سارا ہی ادبی مال عسکری صاحب کا دیا ہوا ہے۔ اور پھر یہ کہ میں تو عسکری صاحب کے بغیر ادب میں ایک نوالہ نہیں توڑتا۔ اور پھر جب سلیم احمد ابتدا میں جوش اور اقبال کے زیر اثر نظم گوئی کی طرف مائل تھے، تو بہ قول جمیل جالبی عسکری صاحب کے کہنے پر غزل گوئی کی طرف اس شعوری منشور کے ساتھ آئے کہ "اردو شاعری کے مختلف اسالیب اور رنگوں کو اپنے اندر اس طرح جذب کیا جائے کہ اردو کے تمام غزل گو شعرا کی آواز سلیم احمد کی غزل کا حصہ بن جائے"[4]، جس پر بہت سے لوگوں نے سلیم احمد پر یہ الزام لگانا شروع کر دیا کہ ان کی خود کی ادبی حیثیت کچھ نہیں ہے، ان کی شخصیت عسکری کی شخصیت سے الگ نہیں کی جاسکتی۔

عسکری صاحب کا اسلوب کو اپنانے کی شعوری کوشش

سلیم احمد کے اسلوب کو دیکھیے تو واضح پتا چلتا ہے کہ انھوں نے عسکری صاحب کے اسلوب کو اپنانے کی شعوری کوشش کی ہے، خصوصاً سلاست اور شگفتگی کا معیار سلیم احمد کے یہاں عسکری صاحب سے زیادہ مماثلت رکھتا ہے۔ واضح اور دوٹوک انداز بیان میں بڑی حد تک یکسانیت دیکھی جاسکتی ہے۔ ادب برائے ادب کے بھی سلیم احمد قائل نظر آتے ہیں لیکن عسکری صاحب کی طرح ایسے ادب برائے ادب کے جس میں حقیقی زندگی کی مکمل عکاسی ملتی ہو۔ عسکری صاحب کی طرح میر اور فراق دونوں کو پسند کرتے ہیں۔ سر سید احمد خان اور حالی کی جدیدیت پر عسکری صاحب کی طرح شدید اعتراضات اٹھاتے نظر آتے ہیں۔ ابن العربی کا گہرائی سے مطالعہ ہو یا فرانسیسی عالم رینے گینوں سے دلچسپی یقیناً عسکری صاحب کے زیر اثر سلیم احمد کے ہاں پیدا ہوئی۔ ترقی پسندوں کی کھلی اور بے طرح مخالفت بھی اسی ذیل میں رکھی جاسکتی ہے۔ قیام پاکستان کے ساتھ ہی نظریہ پاکستان کی شدومد سے حمایت، اسلامی / پاکستانی ادب کے مباحث بھی عسکری صاحب کے تصورات کی اثر پذیری کی مثالیں کہی جاسکتی ہیں۔

غالب اور میر کے حوالے سے عسکری کی تنقید کے اثرات

"غالب کون" لکھتے ہوئے میر کی یاد کم نہیں ہوتی اور اس کتاب کا انتساب "خدا سخن میر تقی میر کے نام" کرتے ہوئے غالب کے ناسخ کی ہمنوائی والے مصرعے سے کیا: ع آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں۔ میر کے ساتھ عسکری صاحب کو بھی نہیں بھولے۔ محمد حسن عسکری کہ اردو کے پروفیسروں سے بہت چڑھتے ہیں اور آج کل مغرب کے ادیبوں سے بھی تپے ہوئے ہیں۔ انھوں نے ہر کس و ناکس یہاں تک کہ رسل صاحب کو بھی غالب پر بولتے سنا تو ایک بار پھر پوچھ لیا، غالب کون؟ ایسی فضا میں جب غالب کی شہرت بر صغیر پاک و ہند کے گلی کوچوں سے نکل کر یورپ اور امریکا کے بازاروں اور چین اور روس کے مکینوں تک پہنچ چکی ہے، اور لوگ بزعم خود ہر سوال کا خاتمہ کر چکے ہیں۔ لوگوں کو عسکری کا استفسار اتنا برا معلوم ہوا کہ چہرے بگڑ گئے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سوال اتنا ہی سچا ہے جتنا غالب کی زندگی میں تھا اور یقیناً غالب کی صد سالہ برسی پر یہ بر محل پوچھا گیا۔ عسکری کے سوال کو دو سال اور روح عصر کے سوال کو سوا سو سال ہو چکے ہیں، اس لیے مزید تاخیر مناسب نہیں، ہمارا جواب

[4] خواجہ رضی حیدر، سلیم احمد: مشاہدے، مطالعے اور تاثرات کی روشنی میں (لاہور: کتاب محل، 2017ء)، 44۔

حاضر ہے۔[5] 160 صفحات کی اس کتاب کو عسکری صاحب کا جواب کہتے ہوئے سلیم احمد نے غالب کی شاعری اور شخصیت کے کئی پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ غالب کو بڑا شاعر بھی مانتے ہیں اور میر کے تقابل میں انھیں کمتر بھی دکھاتے ہیں۔ عسکری صاحب نے جو غالب کے بارے رائے دی تھی کہ غالب خود کو دوسروں سے مختلف اور برتر دکھانا چاہتا ہے، جب کہ میر عام لوگوں کی سطح پر آکر بات کرنے کے عادی ہیں، اس رائے کا اظہار سلیم احمد کے ہاں بھی ملتا ہے۔ عسکری صاحب کے "انسان اور آدمی" کی بحث میں بھی غالب کے حوالے سے بات کرتے دکھائی دیتے ہیں:

> غالب دکھانا چاہتا ہے کہ وہ دوسروں سے مختلف ہے۔ اسے اس اختلاف پر الجھن نہیں ہوتی۔ افسوس نہیں ہوتا بلکہ فخر۔ وہ اپنے اور دوسروں کے درمیان خلیج کو زیادہ سے زیادہ بڑھانا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس میر لوگوں سے مختلف تھے اور عام لوگوں سے کٹ کر بلکل الگ ہو گئے تھے۔ مگر خلیج کو کم کرنا چاہتے تھے۔ عام لوگوں کی زندگیوں میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ اس خواہش سے میر کا اسلوب پیدا ہوا ہے۔ میر کا اسلوب انھیں لوگوں سے جوڑتا ہے، غالب کا اسلوب توڑتا ہے... غالب بہت چیختا چلاتا ہے مگر فطرت کی قوتیں اپنے کام میں لگی ہیں۔ غالب بڑا انسان تھا۔ وہ اسے آدمی بنانے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ عشق سے غالب نے بڑا چھل فریب کیا تھا۔ وہ پندار کا صنم کدہ ویران کرنے لگتا ہے۔ دوسروں کو چابک مار کر بھگایا تھا وہ پہلے نکتہ چیں اور پھر مشورہ دینے والے بل کہ مصلح بن جاتے ہیں۔ خدا پر بڑے اعتراض کیے تھے، مگر معلوم ہو جاتا ہے کہ خدا سے لڑا نہیں جا سکتا صرف اس کے آگے سر جھکایا جا سکتا ہے۔ یوں غالب سچ مچ آدمی بننے لگتا ہے آدمی اور صوفی ۔ اس انجام تک پہنچنے کے کئی مرحلے ہیں اور ان میں کئی باتوں کی داغ بیل ابتدائی عمر میں پہنچ چکی تھی، مگر آخر تک پہنچتے پہنچتے غالب کئی لہجوں میں بولتا ہے۔ خاتمہ کلام اب اللہ ہی اللہ ہے۔ غالب کی ان تبدیلیوں کے ساتھ اسلوب بھی بدلنے لگتا ہے۔ غالب میر کی زبان بولنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ جناتوں کی نہیں عام انسانوں کی زبان ہے۔ غالب کا اسلوب سادگی کی طرف بڑھتا جاتا ہے اور کیسی سادگی کہ پرکاری سے گلے مل رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کوشش کے باوجود غالب عام آدمیوں سے پوری ہم آہنگی نہیں حاصل کر پاتا۔[6]

سلیم صاحب اب اس کتاب میں غالب کی خوبیوں اور خامیوں کو ایک ایک کر کے سامنے لاتے ہیں۔ عسکری صاحب کے غالب کے متعلقہ تمام خیالات بھی ان کے پیش نظر ہیں۔ ان میں بہت سے خیالات کی توسیع و وضاحت کرتے نظر آتے ہیں ، لیکن جہاں جہاں انھیں اختلافات نظر آئے وہ بھی ایک سچے ادیب کی طرح پوری ایمان داری سے بیان کر دیے۔ ادیب کی سچے اور کھرے ہونے پر عسکری صاحب نے بھی زور دیا اور خود سلیم احمد نے بھی اپنے کئی ایک مضامین میں ادیب سے ایمان داری کا تقاضا کیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خود سلیم احمد یہاں اس کی عملی مثال پیش کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ انھیں عسکری صاحب کا ذوق کو غالب پر ترجیح دینا مناسب نہ لگا تو اس کتاب میں اس بات کا برملا اظہار کیا اور ساتھ ہی غالب کے تصوفانہ تصورات کا

---

[5] سلیم احمد، غالب کون (کراچی: مطبوعات المشرق، 1971ء) 6۔

[6] سلیم احمد، غالب کون، 134 – 136۔

مطالعہ بھی بڑی گہرائی اور خلوص کے ساتھ پیش کرتے ہوئے حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ عسکری صاحب کو داغ تک کی شاعری میں تو تصوف نظر آ گیا، لیکن وہ اسے غالب کی شاعری سے استخراج کرنے میں ناکام رہے۔ سلیم احمد کا کہنا ہے کہ عسکری صاحب کے اعلان "اردو کی اصل شعری روایت تصوف کی ہے" کے بعد تو ہر نقاد اپنی بساط بھر کوشش میں مصروف ہے کہ وہ غالب کو صوفی ثابت کر سکے۔ احمد نسیم نے کہا کہ "غالب کو ساری زندگی فلسفی شاعر سمجھ کر پڑھا اب معلوم ہوا صوفی شاعر ہے۔"[75] جیلانی کامران نے لکھا کہ ابن عربی کو سمجھے بغیر غالب سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ عبید اللہ علیم صاحب غالب کو درد سے بڑا صوفی شاعر کہتے ہیں، حتیٰ کہ ممتاز حسین تک غالب کے تصوفانہ تصورات سے انکاری نہیں: "ہمارے عسکری صاحب عجیب ہیں۔ انھوں نے داغ کو تو صوفی شاعر مان لیا مگر غالب کے سلسلہ میں صاف مکر گئے کہ تصوف جانتا تھا۔ انھوں نے تو حد یہ کر دی کہ کہہ دیا کہ ذوق غالب سے زیادہ تصوف کا شاعر ہے۔ زیادہ بھی اور بہتر بھی ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم نہ محمد حسین آزاد کے پیرو ہیں نہ حالی کے مقلد۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ذوق اور غالب میں کس کو بہتر مانیں۔ ویسے ہماری دوسری مشکل یہ ہے کہ ذوق کے ہمیں کل تین شعر یاد ہیں۔ اور غالب کا پورا دیوان حفظ ہے۔ ساری زندگی غالب کو غالب سمجھا اب ایک دن کے ذوق سے پوری زندگی کے غالب کو کیسے بھول جائیں گے۔"[8] سلیم احمد غالب کو بھولے بھی نہیں ہیں وہ غالب کی عظمت کو بھی یاد رکھتے ہیں لیکن ترقی پسندوں اور خاص طور پر ممتاز حسین کے اس دعوے پر کہ غالب کو مغربی صنعتی نظام، کلکتہ اور ریل گاڑی وغیرہ نے غالب بنانے میں معاونت دی، سلیم احمد کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے اور یوں دیکھیے کہ ہندوستان میں صنعتی نظام تو انگریز لائے مگر مغرب میں کون لایا؟ اور دوسرا یہ کہ اگر ہندوستان میں انگریزوں کی آمد نہ ہوتی تو کیا ہم اپنے اندر سے انقلاب کو پیدا نہ کر لیتے؟ جب انقلاب انگریزوں کی مدد کے بغیر معاشرے کے اندرونی قانون سے پیدا ہو سکتا ہے تو اس قانون کے نتیجے میں غالب کیوں نہیں پیدا ہو سکتا اور اس سے کلکتہ تک دوڑ آنے کی کیا ضرورت ہے۔[9] سلیم احمد کا کہنا ہے کہ غالب کی عظمت اور دیدہ وری غالب کے جوہر ذات میں موجود تھی وہ خارج سے متاثر نہیں ہے، بل کہ وہ ذاتی تجربے سے خارج کو متاثر کرتا ہے۔ غالب کی عظمت کا اعتراف ہو یا اس کی شخصیت کی کم زوریاں دکھائی جا رہی ہوں سلیم احمد عسکری صاحب کی طرح ترقی پسندوں کو نشانے پر ضرور رکھتے ہیں۔ غالب کی عصریت کو ہر دور میں آپ دیکھ سکتے ہیں وہ حالی کا بھی ہم عصر ہے، اگر بجنوری کے لیے اس کا دیوان وید مقدس ہے تو ہمارے لیے بھی ان کا دیوان قرآن ثابت ہوا ہے۔ لکھتے ہیں:

> یہ دیوان ہمارا قرآن کیوں ہے؟ یعنی غالب کی اصلیت کے کیا معنی ہیں؟ غالب... حالی کا ہم عصر تھا جس نے یادگار غالب لکھی اور بتایا کہ غالب اس کا شاعر ہے وہ عبدالرحمن بجنوری کا ہم عصر ہے جس نے اعلان کیا کہ غالب اس کا وید مقدس ہے۔ وہ اقبال کا ہم عصر ہے جس نے اس میں شاعر المانوی کا مقابل پایا وہ ہمارا ہم عصر ہے کہ ہم آم بھی کھاتے ہیں تو غالب کا حوالہ دے کر... دراصل وہ غالب ہم سے پہلے لوگوں کا ہم عصر تھا، یعنی عبدالرحمن بجنوری اور

[7] سلیم احمد، غالب کون، 85۔

[8] سلیم احمد، غالب کون، 85- 86۔

[9] سلیم احمد، غالب کون، 152 – 153۔

> ان لوگوں کا جو... نٹشے، برنارڈ شا اور آسکر وائلڈ وغیرہ سے متاثر تھے۔ اس نسل کا مزاج وہ تدمغ لیے ہوئے ہے جو غالب کے بلند آہنگ کلام میں پایا جاتا ہے یہ تدمغ نیاز فتحپوری میں بھی ہے اور ابوالکلام آزاد میں بھی۔ یہ لوگ کولن ولسن کی اصطلاح میں وہ لوگ تھے جو "ہیرو" پر یقین رکھتے تھے بل کہ خود کو ہیرو سمجھتے تھے۔ اس کے بعد غالب ایک طرف فانی کا غم پرست بل کہ مرگ پرست انسان بن گیا اور دوسری طرف اقبال اور جوش سے ہوتا ہوا ترقی پسند شاعری کی طرف نکل گیا یہ سب بلند آہنگ، مثبت، پر عظمت غالب کی چھوٹی بڑی شکلیں ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی دوسرا غالب بھی بر سر عمل رہا۔ وہ فانی سے آگے بڑھ کر کچھ دیر ان لوگوں میں ظاہر ہوا جن پر ترقی پسند قنوطیت، شکست خوردگی اور مایوسی کا الزام لگاتے تھے۔ بظاہر ایسا لگا جیسے یہ لوگ سردار جعفری جیسے لوگوں سے ہار جائیں گے مگر یہ ایک دھوکا تھا۔ شکست کی آواز والا غالب شاعروں کی نئی نسل میں پھر ظہور پذیر ہو گیا اور اس قوت کے ساتھ کہ ترقی پسند بھی بھونچکا کر رہ گئے بل کہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ سردار اور مخدوم تک غمزدگی کی شاعری کی طرف پلٹ آئے۔[10]

"محمد حسن عسکری (آدمی یا انسان)" پر ایک سرسری نظر دوڑائیں تو عسکری کے اثرات واضح دیکھے جاسکتے ہیں۔ ایک تو یہ کتاب براہ راست عسکری پر ہے دوسرا یہ مضمون پہلے عسکری صاحب نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے، لیکن سلیم احمد نے اپنی طرف سے اس میں اضافے بھی کیے اور عسکری کے خیالات کا تطابق خود عسکری پر کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ یہ مختصر کتاب جسے ایک مضمون بھی کہا جاسکتا ہے، مصنف نے ابتدائیہ کے بعد چھوٹے چھوٹے گیارہ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ انسان یا آدمی پر عسکری صاحب نے بڑی عرق ریزی سے لکھا، جس کی تفصیل پچھلے باب میں دیکھی جاسکتی ہے، کیوں کہ یہ قول غالب: آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا۔ عسکری کے نزدیک بھی یہ سوال بہت لائق اعتنا ہے اور عسکری صاحب نے واقعتاً اس پر بھرپور توجہ صرف کی۔ اور اس کے دونوں پہلوؤں پر دو الگ الگ وقیع مضامین لکھے ہیں، جس کی اہمیت کا ثبوت یہ قول سلیم احمد یہی کافی ہے کہ اگر عسکری کی ساری تحریریں کسی وجہ سے تلف ہو جائیں اور صرف یہی ایک مضمون باقی رہے تو اس کی مدد سے ان کے پورے نقطہ نظر کو دوبارہ مرتب کیا جاسکتا ہے۔ اس سوال کی اسی اہمیت کے پیش نظر سلیم صاحب کو بھی محسوس ہوا کہ وہ بھی اس پر کچھ لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، سو انھوں نے بھی اس پر بہت محنت سے لکھا ہے، تو کیوں نہ اس کتاب کو دیکھ لیں۔ ابتدائیہ میں سلیم احمد نے عسکری صاحب کی شخصیت کو اپنی ذہانت و فطانت، علمیت اور بصیرت، گہرائی اور گیرائی، وسعت و عظمت کے لحاظ سے جدید اردو ادب میں ایک نادر و نایاب چیز قرار دیا ہے۔ سلیم صاحب سمجھتے ہیں کہ انسان کیسے حقیقی معنوں میں انسان بنتا ہے۔ انسان کے باہمی رشتے کیا ہیں۔ اور پھر کائنات میں انسان کا مقام کیا بنتا ہے، ان سب کا جیسا شعور حسن عسکری کو تھا اور کسی کے بس کی بات نہیں۔ اور جو کچھ عسکری نے لکھا وہ اسی شعور کی دین ہے۔ سلیم احمد لکھتے ہیں:

---

[10] سلیم احمد، غالب کون، 153 -154۔

ایسا لگتا ہے جیسے محمد حسن عسکری نے اپنی روح کو انسانیت کی تجربہ گاہ بنالیا تھا اور اس کے اندر بیٹھ کر وہ ہر وقت یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے کہ انسانی ہستی اپنی تمام قوتوں اور کمزوریوں کے ساتھ کیا چیز ہے اور کائنات میں اس کا مقام اور تقدیر کیا ہے؟ یہ سوال ایسے نہیں ہیں جو ہر کس و ناکس کو سڑک پر پڑے مل جائیں۔ عسکری کے یہ سوال خود عسکری کے تجربات سے پیدا ہوئے تھے، اور ان کا جیسا جواب عسکری نے دیا ہے وہ عسکری کے سوا اور کوئی نہ دے سکتا تھا۔[11]

سلیم احمد نے اس کتاب کے لکھنے میں جس طریقے کو بنیاد بنایا ہے وہ بھی در حقیقت عسکری صاحب سے استفادے کا اظہار یہ ہے۔ جس طرح عسکری صاحب کسی ادیب پر لکھتے وقت اس کے مرکزی مسئلے کے حوالے سے بات کرتے ہیں بالکل اسی طرح سلیم احمد نے عسکری پر لکھتے ہوئے ان کے مرکزی مسئلے کو موضوع گفت گو بنایا۔ نہ صرف اس کتاب میں بل کہ دوسرے کئی ایک تنقیدی کاموں میں اس طریقہ کار کی جھلک نمایاں طور پر موجود ہوتی ہے۔ مثال کے لیے ان کے مضامین کے نام ہی دیکھ لیجیے۔ "نئی نظم اور پورا آدمی"، "کسری آدمی"، "کسری آدمی کا سفر" وغیرہ۔

انسان اور آدمی کے تصورات

یہاں سلیم احمد نے عسکری صاحب کا بنیادی مسئلہ "انسان اور آدمی" قرار دیا ہے۔ عسکری صاحب کی شخصیت کو اردو ادب میں ایک "روحانی سفر کا استعارہ" بتاتے ہوئے ان کی شخصیت اور ان کے ادبی سفر کی تفہیم کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عسکری صاحب 36ء کی تحریک سے وابستہ تھے، تو یوں کچھ عرصہ وہ ترقی پسند بھی سمجھے گئے۔ اس کے بعد ان کی نصف زندگی اردو ادب کو وہ راہیں سجھانے میں گزری جس کے بغیر کوئی ادب سچا ادب نہیں کہلا سکتا۔ عسکری صاحب اپنی نصف زندگی میں پیروی مغرب کے سب سے بڑے مبلغ کے طور پر پہچانے گئے۔ سلیم احمد کے خیال میں اردو ادب نے مغربی ادب کے بارے میں جو چند باتیں سیکھی ہیں یقیناً وہ عسکری کے ذریعے سے سیکھی ہیں۔ لیکن پھر ایک وقت آیا کہ جب عسکری صاحب کے زندگی اور شعور میں ایک بڑی تبدیلی پیدا ہوئی، یوں وہ مغرب کے خلاف ہو گئے اور پیروی مغرب کو سعی لاحاصل سمجھنے لگے۔ عسکری صاحب نے جن بتوں کو اونچے سنگھاسنوں پر براجمان کیا تھا، خود اپنے ہاتھوں انھیں خاک میں ملانے تلے ہیں۔ عسکری صاحب کی اس تبدیلی کو سلیم احمد سمجھنے کے لیے عسکری صاحب کا طریقہ کار اپناتے ہوئے پہلے کچھ سوالات قائم کر لیتے ہیں۔ جیسے کہ یہ تبدیلی ان میں کیوں آئی؟ کیا یہ تبدیلی ان کے سفر کا لازمی حصہ تھی؟ یا پھر ان کے تجربات اور شعور کی نوعیت ایسی تھی کہ وہ اس منزل پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتے تھے؟ یا پھر کوئی ایسی تبدیلی تھی جو محض اتفاقاً پیدا ہوئی؟ اب ان سوالوں کے جوابات کو سمجھے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ سلیم احمد اس پر کچھ مزید بات کرنا چاہتے ہیں تو بھی عسکری صاحب کے اسلوب کو اپناتے ہوئے چلتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جوں ہی وہ اس موضوع کی طرف آتے ہیں تو عسکری صاحب کے طریقہ تحریر کے زیر اثر پہلے اس مضمون کو سیاق و سباق کے لحاظ سے بھرپور وضاحت سے لکھتے ہیں اور جیسے ہی کچھ وضاحت کرتے ہیں تو فوراً مغربی فلسفیوں اور ناقدین کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔ ہم یہاں سلیم احمد کا ایک اقتباس نقل کرنا چاہیں گے کہ جس میں آپ محسوس کریں گے کہ یہ اسلوب اور انداز نقد عسکری کا ہی ہو سکتا ہے:

---

[11] سلیم احمد، محمد حسن عسکری- آدمی یا انسان (کراچی: مکتبہ اسلوب، 1982ء) 23۔

قبل اس کے کہ ہم عسکری صاحب کے مضمون کو ہاتھ لگائیں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ "انسان اور آدمی" کے بارے میں خود اپنے تاثرات کا جائزہ لیں۔ ہم انسان اور آدمی سے کیا سمجھتے ہیں۔ ذاتی طور پر میرے تاثرات کیا ہیں۔ اسے میں اوسپنسکی کی مدد سے بیان کر سکتا ہوں اوسپنسکی نے لکھا ہے کہ آدمی دو قسم کے اثرات کے تحت زندگی بسر کرتا ہے... پہلی قسم کے اثرات وہبی ہوتے ہیں دوسری قسم کے اکتسابی۔ اوسپنسکی پہلی قسم کے اثرات کے مجموعے کو جوہر کہتا ہے دوسری قسم کے اثرات کے مجموعے کو شخصیت۔ اب آدمی کے ارتقا کے لیے ضروری ہے کہ اس کا جوہر اور شخصیت بیک وقت ترقی کرے اور ایک دوسرے سے ہم آہنگی میں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوں۔ لیکن بدقسمتی سے عملاً ایسا نہیں ہوتا۔ بعض لوگوں میں جوہر کا غلبہ ہو جاتا ہے، بعض لوگوں میں شخصیت کا، کچھ لوگوں میں جوہر اتنا بڑھ جاتا ہے کہ شخصیت دبک کر رہ جاتی ہے، کچھ لوگوں میں شخصیت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ جوہر ٹھٹھر کر رہ جاتا ہے۔ اب اوسپنسکی کے نزدیک انسانیت کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ آدمی اپنے جوہر اور شخصیت دونوں کی ہم آہنگ ترقی کیسے حاصل کرے۔ لیجیے اب اس عبارت میں جوہر اور شخصیت کے الفاظ ہٹا کر ان کی جگہ عسکری صاحب کے الفاظ رکھ دیجیے۔ آدمی اور انسان۔ جوہر آدمی کے مترادف ہے یعنی وہ جبلی، حیاتیاتی، وہبی، وجود جو ہم سب میں مشترک طور پر پایا جاتا ہے۔ اور انسان وہ معتقداتی، اخلاقی، تصوراتی وجود جو ہم تہذیب سے اخذ کرتے ہیں۔ یوں ہمارے اندر انسان اور آدمی بیک وقت موجود ہوتے ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کچھ لوگوں میں آدمی کا غلبہ ہوتا ہے کچھ لوگوں میں انسان کا۔[12]

ترقی پسند نظریات سے اختلاف

عسکری صاحب نے ترقی پسندوں کے خلاف بہت کچھ لکھا، اور حالی صاحب کو بھی ادب میں خرابی کی جڑ سمجھتے ہیں۔ سلیم احمد نے بھی ترقی پسند تحریک اور حالی صاحب کے خلاف بہت لکھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں عسکری صاحب اپنے مضامین میں کسی موضوع یا کسی شخصیت کے خلاف بات کرتے ہیں تو عموماً مختصر یا کبھی محض اشاروں اور کنایوں میں بات کرتے ہیں، جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ سلیم احمد انھیں نکات پر بھرپور وضاحت اور مدلل بحث کا آغاز کر دیتے ہیں۔ ترقی پسندوں پر بات کرنے سے قبل اگر ہم حالی صاحب کے حوالے سے سلیم احمد کی تنقید کا جائزہ لیں تو ہمیں ان کے کئی ایک مضامین میں حالی صاحب کا ذکر نظر آتا ہے، حتیٰ کہ سلیم احمد نے دو مکمل اور بھرپور مضامین ان پر لکھ دیے۔ ایک "غزل، مفلر اور ہندوستان" اور دوسرا "حالی سے لا مساوی انسان تک"۔ یہ درست ہے کہ عسکری صاحب نے حالی پر لکھتے ہوئے حالی صاحب کی خدمات کا بھی اعتراف کیا ہے، لیکن ان کی بزعم خود اصلاح پسندی کو ادب کے لیے قطعی بے سود قرار دیتے تھے۔ سلیم احمد نے بھی حالی صاحب کی ادبی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیا اور ان کی اچھی باتوں کو سراہا بھی، لیکن ان کے نقائص کو بھی پوری وضاحت سے بیان کیا ہے۔ حالی صاحب کے

[12] سلیم احمد، محمد حسن عسکری- آدمی یا انسان، 27 – 28۔

تصورات کو ہمدردی سے، پورے غوروخوض سے جانچا، ترقی پسندوں نے جو کچھ حالی صاحب کے حوالے سے تصویریں دکھائیں کہ حالی نے ہمیں نیاسیاسی شعور دیا۔ نئے زمانے اور نئے ماحول کے تقاضوں اور ضرورتوں سے آگاہ کیا۔ ایک نئے ذوق کی شاعری کی پرورش کی۔ انسانیت اور ہمدردی کے ایک نئے احساس کو جنم دیا۔ سلیم احمد ان سب باتوں کو یک قلم مسترد نہیں کرتے بل کہ ان پر ہمدردانہ غور کرتے ہیں اور کہیں نہ کہیں انھیں درست مانتے ہیں۔ لیکن حالی صاحب کے ان تصورات کے نتائج میں پیدا ہونے والا ادب، سلیم صاحب کو مطمئن نہیں کرتا، وہ سمجھتے ہیں کہ حالی صاحب کے یہ تصورات ایک جان دار اور وقیع ادب پیدا کرنے کی راہ میں رکاوٹ کا باعث بنے ہیں۔ "غزل، مفلر اور ہندوستان" میں سلیم احمد بتاتے ہیں کہ حالی صاحب کی غزل بیزاری کی وجہ، کلیم الدین صاحب کی وجہ بیزاری کی طرح ناقص ہیئت نہیں تھی۔ نہ جوش صاحب والا انھیں اعتراض تھا کہ "جذبے اور خیال کے بجائے الفاظ شاعر کی راہ نمائی کرتے ہیں" بل کہ انھیں تو عظمت اللہ خان کی طرح غزل میں "واقعیت" کے فقدان کی بھی شکایت نہیں تھی۔ مولانا کو غزل ہی نہیں بل کہ شاعری کی جملہ اصناف بالکل خرافات لگتی تھیں کیوں کہ یہ قومی خدمات سر انجام دینے سے محروم تھیں۔ اور حالی صاحب کا واضح پیغام تھا: ع کچھ کرلو نوجوانو! اٹھتی جوانیاں ہیں۔ یہ وہ پیغام تھا جو سر سید احمد خان کے زیر اثر ہندوستان میں عام ہونے لگا، لیکن جن نوجوانوں سے یہ خطاب کیا گیا دراصل ان کے مسائل کیا تھے، اور حالی صاحب کے پیغام کا ان پر کیا اثر پڑا اس حوالے سے جب سلیم صاحب غور کرتے ہیں تو حالی صاحب کی نئی غزل کو زیر بحث لاتے ہیں جن کے متعلق ترقی پسند مصنفین کا کہنا ہے کہ حالی نے ہمیں نیا سیاسی شعور دیا۔ نیا سیاسی شعور، نیا زمانہ، نئے ماحول کے تقاضے اور نیا ذوق شعری وغیرہ سب درست۔ لیکن ان جوابوں کے باوجود یہ سوال اپنی جگہ پر ہے کہ حالی صاحب کی نئی غزل میں جنسی جذبے کی تہذیب کا کیا مقام ہے؟ ہمیں افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مولانا کی نئی غزل ہمیں اپنے نوجوانوں کے جنسی مسائل کے بارے میں کچھ نہیں بتاتی۔[13] عسکری صاحب جن باتوں کو اشاروں کنایوں میں کرتے ہیں ان کی بڑی تفصیل سے وضاحت سلیم احمد کرتے ہیں اور حتیٰ کہ عسکری پر اٹھائے گئے اعتراضات کے جوابات بھی سلیم احمد دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں بھی وہ حالی صاحب کے تصورات کا ایک خاکہ بناتے ہیں پھر اس کی خامیوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ مثلاً حالی صاحب نے کہا ہے کہ "غزل اب تک عشقیہ جذبات کی ترجمانی کرتی رہی ہے" اب غزل میں عشقیہ جذبات کا خاتمہ ہونا چاہیے اور وہ قوم کی بدحالی کے تدارک کے لیے سرگرم رہے۔ لیکن حالی صاحب نے تغزل کو برقرار رکھنے کی پرزور حمایت کی ہے:

> حالی نے دو نسخے تجویز کیے۔ پہلا نسخہ ڈراوے کا تھا۔ یعنی حالی نے "اے عشق تونے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا" والی مسلسل غزل لکھ کر انھیں بتایا کہ عشق سے افراد اور اقوام کو کیا کیا نقصانات پہنچ سکتے ہیں۔ دوسرا نسخہ شرافت کا تھا۔ یعنی اگر آپ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے باوجود اس موذی مرض سے نجات حاصل نہیں کرسکتے تو کم از کم شرفا میں بیٹھ کر اس سر مکتوم کو فاش کرکے اپنی تنگ ظرفی اور بے حوصلگی کو ظاہر نہ کیجیے۔ حالی کے اس دوسرے نسخے نے "نئی غزل" کو بڑی تقویت پہنچائی، اور رفتہ رفتہ ایسے شریف شاعروں اور ادیبوں کی تعداد روز بہ روز بڑھنے لگی جنھوں نے ذاتی تجربے کو ادب سے نکال

[13] جمال پانی پتی، مضامین سلیم احمد، 89۔

پھینکا اور شریفانہ جذبات کے اظہار کو ادب پرستی، انسانیت دوستی، اور تہذیب پروری کا مظہر سمجھ لیا۔ فسادات کا مقبول و معروف ادب حالی کی اس معنوی اولاد نے پیدا کیا۔[14]

عسکری صاحب کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ کسی مضمون پر بات کر رہے ہوں، بیچ میں ترقی پسندوں کے رویے پر ضرور کچھ نہ کچھ بات کیے جاتے ہیں۔ یہی خصوصیت ہم سلیم احمد کے ہاں بھی دیکھتے ہیں۔ حالی صاحب پر بات کرتے ہوئے ترقی پسندوں پر بھی ایک دو نشتر چلائے بغیر مضمون مکمل نہیں کر پاتے۔ ان کا کہنا ہے کہ ترقی پسند یا نئے ادیب اپنے آپ کو ادیب کے بجائے ڈاکٹر کہلانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ معاشرے کے رستے ہوئے غلیظ ناسوروں اور چھپے ہوئے گندے امراض کی تشخیص کریں گے۔ اس مرحلے سے جب اکتا گئے تو وہ ڈاکٹر کے بجائے لیڈر بننے کی خواہش کرتے پائے جاتے ہیں۔ لیڈروں کی ضروریات ڈاکٹروں سے مختلف ہوتی ہیں۔ انھیں سب سے پہلے لوگوں کو خوش رکھنا پڑتا ہے۔ ترقی پسندوں کو بھی یہی کرنا پڑا انھوں نے سب سے پہلے متوسط طبقے کو خوش کیا... ترقی پسند اب مولانا ماہر القادری کی زبان بول رہے تھے۔ "نئے ادیبوں نے بڑی غلطیاں کی ہیں ہمیں ان کی غلطیوں کی اصلاح کرنی چاہیے۔ ادب سماجی اور سیاسی شعور کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اسے جنسی بھول بھلیوں میں مبتلا کر دینا نہایت مریضانہ حرکت ہے۔ ہمیں پچھلی غلطیوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے فوراً فحش نگاری کا سدِباب کرنا چاہیے۔[15]

ہند اسلامی تہذیب کا تصور

عسکری صاحب نے پاکستان کے قیام کے بعد پاکستانی ادب / اسلامی ادب اور تہذیب و کلچر کے حوالے سے کافی کچھ لکھا ہے۔ اوپر ہم نے لکھا ہے کہ عسکری صاحب جن باتوں کو اختصار سے بیان کرتے ہیں ان کی تفصیلی وضاحت سلیم احمد کے مضامین میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ہند اسلامی تہذیب ہی پاکستان کی تہذیب ہوگی، اس پر عسکری صاحب نے بہت اصرار کیا ہے، اس پر سلیم احمد نے بڑی دل جمعی کے ساتھ بھرپور وضاحتی مضامین لکھے ہیں۔ عسکری صاحب کی طرح سلیم احمد بھی ہند اسلامی تہذیب پر بات کرتے ہوئے مغربی تہذیب کی ہند اسلامی تہذیب سے آویزش کی مجموعی صورت حال پر غور و خوض کرتے ہیں تو انھیں بھی عسکری صاحب کی طرح محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ اپنی تہذیب کی کوئی بھی چیز چھوڑنے کو تیار ہے نہ ہی مغربی تہذیب سے کچھ لینے کی ضرورت سمجھتا ہے۔ یعنی ان کا پختہ خیال ہے کہ یہ دونوں تہذیبیں کبھی ایک نہیں ہو سکتی ہیں۔ اور اگر ان کے ملاپ کی کوئی کوشش ہوتی ہے تو اس کا سیدھا مطلب اپنی تہذیب کی تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ دوسرے گروہ کے خیالات میں یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ نہ تو الگ تھلگ رہا جا سکتا ہے اور نہ ہی مغربی تہذیب کے اثرات کو روکا جا سکتا ہے اس لیے جہاں تک ان سے بچا جا سکتا ہے بچنا چاہیے اور جتنا قبول کیا جا سکتا ہے اسے قبول کر لینا چاہیے۔ اس سوچ کے حامی حالی صاحب بھی ہیں۔ اگرچہ اس سوچ میں بھی خامی ہے لیکن پہلے خیال کی نسبت زیادہ کامیاب ثابت ہوا۔ اس خیال میں خامی یہ تھی کہ ہر شخص نے اچھائی اور برائی کا پیمانہ خود اپنے حساب سے بنا لیا۔ انگریزی زبان سے لے کر ان کے کھانے پینے اور پہننے کے انداز تک کو زیر بحث لایا گیا کہ ان میں کون سی باتوں کی ہمیں اسلام اجازت دیتا ہے، یوں اس بات پر کہ رسومات اور مذہب الگ الگ چیزیں ہیں، اور انگریزی رسم و رواج اپنانے سے ہمارے مذہب پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایک بات پختہ تر ہو گئی کہ "وہ

---

[14] جمال پانی پتی، مضامین سلیم احمد، 91

[15] جمال پانی پتی، مضامین سلیم احمد، 113۔

تہذیبی اور تمدنی اوضاع جو رسم و رواج اور دوسری معاشرتی شکلوں میں اب تک مذہب کا جزو سمجھے جاتے تھے، وہ مذہب کا جزو نہیں ہیں۔ دوسرے لفظوں میں روایتی مذہبی تہذیب کا ایک حصہ تہذیب سے الگ ہو گیا، اور خود مذہب کو بھی رسوم سے الگ کر لیا گیا۔[16] اس بیانیے کے اثرات قبول کرنے کے بعد مغربی تہذیب ہمارے اندر جگہ بنانے میں کامیاب ہوئی اور ہماری تہذیب اور اور ہمارے مذہب کے بہت سے عناصر اس کے لیے جگہ خالی کرتے گئے اور ہم نے دیکھا کہ پہلے مرحلے پر کہا گیا کہ رسوم کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ دوسرے مرحلے پر کہا گیا کہ فقہ کی تقلید بھی ضروری نہیں ہے اور احادیث اور قرآن کی روشنی میں کوئی بھی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ پھر احادیث کی حجت سے بھی انکار کیا گیا اور کہا گیا کہ ہمارے لیے صرف قرآن کافی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ روایتی مذہبی تہذیب کی روح نے اپنی زمانی و مکانی تشکیل کے لیے جتنے ادارے اور عوامل پیدا کیے تھے، ان سب کا انکار کیا جانے لگا۔ سر سید سے غلام احمد پرویز تک وہ تمام اشخاص و افراد جو روایتی مذہبی تہذیب میں ان تبدیلیوں کے نمائندے ہیں، ہمیں ان سب میں ایک گہرا اضطراب کام کرتا نظر آتا ہے... اصطلاحی لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ ہم ایک سکونی تہذیب سے حرکی تہذیب میں داخل ہو گئے ہیں۔ اور اس تہذیب کی روح ہمیں ہر وہ چیز چھوڑنے پر مجبور کر رہی ہے جو ہمیں تغیر یا حرکت سے روکتی ہے۔ خواہ وہ رسوم ہوں یا فقہ ہو یا احادیث ہوں اور آخر میں چپکے سے یہ بھی کہ خواہ قرآن ہو۔ حرکی تہذیب کا یہی وہ دستور جو سب سے پہلے اقبال کے ذہن میں واضح ہوا۔[17]

ہند پاکستانی ادب کا تشخص

مغربی ادب اور مغربی تہذیب نے ہمارے ادب اور ہماری تہذیب میں کیا تبدیلیاں پیدا کیں، اس بحث سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ پاکستانی ادب کا بنیادی تشخص کیا ہے اور یہ دنیا کی اور قوموں کے ادب سے کس طرح مختلف ہے حتیٰ کہ دنیا اسلام میں پیدا ہونے والے ادب سے یہ کیوں کر اور کیسے اپنی انفرادیت قائم رکھ سکتا ہے؟ اس حوالے سے سلیم احمد کے خیالات کچھ یوں ہیں کہ ادب کسی قوم کے مخصوص طرزِ احساس کا اظہار ہوتا ہے اور یہ طرزِ احساس خدا، کائنات اور انسانوں کے بارے میں اس قوم کے اجتماعی تجربات اور رویوں سے پیدا ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں بنیادی طور پر یہ طرز احساس مشترک ہے وہ ایک ایسے خدا پر یقین رکھتے ہیں جو ایک طرف کائنات سے ماورا ہے اور دوسری طرف کائنات کا ہر ذرّہ ذرّہ میں اس کی صفات کا احساس پایا جاتا ہے۔ وہ ایک طرف کہیں عرش پر ہے تو دوسری طرف انسان کے دل اور اس کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہے۔ کائنات کے بارے میں مسلمانوں کا طرز احساس یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز احکام خداوندی کی پابند ہے، اور زبان حال سے اپنے خالق اور رازق کی تسبیح و تقدیس میں مصروف ہے۔ اس کائنات کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے مسخر کیا ہے۔ لہٰذا انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس سے فائدہ اٹھائے۔ انسانوں کے بارے میں مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اللہ نے انھیں نفس واحد سے پیدا کیا ہے۔ اس لیے نوع انسانی ایک وحدت ہے جسے رنگ و نسل، خون اور علاقے کی بنیاد پر تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سارے امتیازات صرف اس کی شناخت کے لیے ہیں۔ انسانوں میں صرف ایک امتیاز ہے اور وہ عقیدے کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ ایک طرف لوگ خدا کی وحدانیت، کائنات کی حقیقت اور نوع انسانی کی وحدت کے ماننے والے ہیں تو دوسری طرف وہ لوگ جو انھیں نہیں

---

[16] جمال پانی پتی، مضامین سلیم احمد، 257 – 258۔

[17] جمال پانی پتی، مضامین سلیم احمد، 258۔

مانتے، اس کے علاوہ انسانوں میں دوسرا کوئی فرق نہیں ہے۔ اب اس مجموعی طرزِ احساس کا اظہار مسلمانوں کے ادب میں بھی ہوتا ہے اور اسی سے اسلامی ادب کی انفرادیت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اس پر سلیم احمد کا کہنا ہے کہ "مجموعی طور پر مسلمانوں کا طرزِ احساس ایک ہونے کے باوجود قوموں کے لحاظ سے اس طرزِ احساس کی مختلف شکلیں ہیں۔ عربی، ایرانی، ترکی اور ہندی مسلمانوں کا طرزِ احساس بنیادی طور پر ایک ہونے کے باوجود مختلف ہے۔[18] اور یہی اختلاف ان کے ادب میں انفرادیت کا باعث ہوتا ہے۔ سلیم احمد کے نزدیک ان قوموں کے ادب کی روح کو سمجھنے کے لیے ہمیں اس وحدت اور اختلاف دونوں کو سمجھنا پڑے گا اور اسی نقطہ نظر سے وہ پاکستان کے ادب کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سلیم احمد کہتے ہیں کہ پاکستان ہندوستان کا حصہ ہونے اور پھر ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ جو ایک ہزار سال پر محیط ہے اور یہاں کے مسلمان عربی، ایرانی، ترکی اور مقامی باشندوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اپنی ایک تہذیب پیدا کی اور ایک منفرد طرزِ احساس پیدا کر کے دکھایا؛ اس طرزِ احساس کے نمایاں اثرات ہمیں ہندی مسلمانوں کی تہذیب کے جملہ مظاہر میں نظر آتے ہیں۔ سلیم صاحب کا کہنا ہے پاکستانی ادب کے مسئلے کو سمجھنے کے لیے اس طرزِ احساس کو سمجھنا ضروری ہے, لیکن سلیم احمد کو شکوہ ہے کہ ہندی مسلمانوں کی تہذیب اور اس کے مخصوص طرزِ احساس کا مطالعہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ شعر و ادب میں اس بات کی طرف توجہ ہی نہیں کی گئی کہ ہندی مسلمانوں کے شعر و ادب کس طرح دوسرے مسلمانوں کے شعر و ادب سے مختلف ہیں اور اس کی مثال کے لیے وہ غزل کے مسئلہ کو پیش کرتے ہیں کہ اردو غزل کے بارے میں ایک بات تواتر سے کہی گئی ہے کہ یہ فارسی غزل کی نقالی ہے۔ اور یہ خیال اتنا عام ہے کہ اس کی تردید مشکل ہے لیکن اتنا نہیں سوچتے کہ جس نے فن تعمیر میں "تاج محل" اور موسیقی میں "امیر خسرو" پیدا کیا وہ شعر و ادب میں صرف نقال کیسے ہو سکتی ہے؟[19] سلیم احمد اس خیال کی تردید پورے تیقن سے کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ہندی مسلمانوں کا اپنا ایک اجتماعی تجربہ اور اجتماعی طرزِ احساس ہے اور وہ شعر و ادب کے پیچھے بھی اسی طرح کام کر رہا ہے جس طرح ان کی تہذیب کے دوسرے مظاہر میں:

> اگر ہم اردو شعر و ادب کی مرکزی روایت کا تعین کریں اور اسے غزل کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کریں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ اردو غزل کے زمین و آسمان فارسی غزل کے زمین و آسمان سے قطعی مختلف ہیں اور اس کے مجموعی رویے، طرزِ اظہار، اسالیب اور لب ولہجہ فارسی غزل سے مختلف ہے۔ میں نے محمد حسن عسکری کے زیرِ اثر اپنے مضمون میں میر کی غزل اور حافظ کی غزل کا موازنہ کرتے ہوئے دونوں تہذیبوں کے طرزِ احساس کے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی تھی... اگر ہم صرف اس بات پر غور کریں کہ فارسی غزل میں جو بلند آہنگی پائی جاتی ہے وہ اردو غزل میں کیوں نہیں ملتی تو شاید بہت سی باتیں ہماری سمجھ میں آسکتی ہیں۔ فارسی غزل کی بلند آہنگی جذبے کے مکمل اثبات سے پیدا ہوتی ہے۔ فارسی غزل جذبے کو انسانی وجود کے دوسرے مطالبات سے الگ کر لیتی ہے اور جذبے کو اپنی جگہ مکمل سمجھتی

[18] جمال پانی پتی، مضامین سلیم احمد، 782۔

[19] جمال پانی پتی، مضامین سلیم احمد، 783۔

ہے۔ جب کہ اردو غزل جذبے کو دوسرے انسانی مطالبات کے ساتھ ملا کر دیکھتی ہے بالخصوص ان مطالبات کو جنھیں ہم انسانی کمزوریاں کہتے ہیں۔ فارسی غزل اور اردو غزل میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ انسانی مجبوریوں اور کمزوریوں کی طرف فارسی غزل کا رویہ تحقیر کا ہے جب کہ اردو غزل ان کا احترام کرتی ہے۔[20]

پاکستانی اور ہندی مسلمانوں کا طرز احساس

سلیم صاحب کا کہنا ہے کہ پاکستانی ادب کو سمجھنے کے لیے ہندی مسلمانوں کے طرزِ احساس کو سمجھنا اولین ذمہ داری ہے لیکن تعجب ہوتا ہے کہ اس طرف ہمارے ادیبوں نے توجہ کی ہی نہیں۔ حالاں کہ پاکستان کا قیام اسی تہذیبی روایت کے تحفظ کے لیے وجود میں آیا ہے، جو برصغیر میں مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ سے تعلق رکھتی ہے۔[21] اور اس کو سمجھے بغیر ہم اپنا تاریخی سفر آگے نہیں بڑھا سکتے اور اگر ایسا ہے تو ہمیں پاکستان کی روح کو سمجھنے اور پھر اسے برقرار رکھتے ہوئے اپنے مستقبل کی طرف قدم بڑھانا ہوگا۔ برصغیر میں مسلمان ایک فاتح قوم کی حیثیت سے وارد ہو کر اسے اپنا مسکن بنالیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک بنیادی مسئلہ سے بھی دوچار ہوئے کہ برصغیر کی اکثریت غیر مسلم ہے۔ اب یہاں سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ مسلمانوں کی بقا اور استحکام کے لیے غیر مسلم کی طرف کیا رویہ اختیار کیا جائے۔ سلیم احمد کے نزدیک "برصغیر میں مسلمانوں کی پوری فکری اور ذہنی تاریخ اسی سوال کے اردگرد گھومتی ہے اور ان کے مجموعی رویے اسی مسئلے کے حل سے پیدا ہوتے ہیں۔[20] آیا برصغیر کی اکثریت مسلمان بنائی جائے یا دونوں کے درمیان کچھ مشترکہ عناصر ڈھونڈیں جائیں جس سے مفاہمت پیدا کی جاسکتی ہے؟ عسکری صاحب اپنی تنقید میں قیام پاکستان کے آغاز سے ہی اپنی جڑوں کی کھوج اور اپنے تہذیبی تشخص کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش میں مصروف عمل نظر آتے ہیں۔ یہی کوششیں سلیم احمد کے ہاں بڑی سنجیدگی، متانت اور بھرپور وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہیں جس کی ایک مثال ہم ان کے مضامین نظریاتی ریاست میں ادیب کا کردار، ادیب اور مملکت، اسلامی ادب کا مسئلہ، پاکستانی ادب کا مسئلہ، پاکستانی ادیب، جدید تقاضے اور پاکستانی ادب، ادبی انحطاط کا مسئلہ، ادب کا مستقبل، ادب اور تاریخی شعور، حس شدید اور کلچر کا مسئلہ میں دیکھ سکتے ہیں۔ یہ سبھی عنوانات ایسے ہیں جن پر عسکری صاحب نے اپنی بھرپور توجہ صرف کی تھی، بعد ازاں سلیم احمد نے اپنے نقطہ نظر کے ساتھ ادبی تنقید میں انھی کو موضوع بحث بنا دیا۔ سلیم احمد کا خاصا یہ رہا ہے کہ انھوں نے اپنی تنقید کو "تخلیقی تنقید" کے رنگ میں پیش کیا۔ پاکستانی ادب اور تہذیب کے تصورات کو شدتِ جذبات سے سلیم احمد نے برتا ہے اور یوں ان کے خیال اور فکر ان کے جذبے سے گھل مل کر ایک ہونے سے بہ قول تحسین فراقی صاحب ان کی تنقید تہذیب بن گئی ہے۔ ایسی تنقید کے نمونے ان کے پاکستانی ادب / اسلامی ادب کے مضامین میں جابہ جا دیکھے جاسکتے ہیں۔ اگرچہ یہ تصورات حسن عسکری صاحب کے تتبع میں سلیم احمد اپنی تنقید میں زیر بحث لائے مگر سلیم احمد کی جولانی طبع کورانہ تقلید کی عادی ہرگز نہیں ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی تنقید کو "ذاتی تجربے اور باطنی مشاہدے کی سان پر کسا اور پھر اسے رد و قبول کے مرحلے سے

---

[20] جمال پانی پتی، مضامین سلیم احمد، 783 – 784۔

[21] جمال پانی پتی، مضامین سلیم احمد، 784۔

گزارا۔ افکار کی حیثیت ان کے نزدیک مقدس گائے کی نہیں تھی وہ انھیں ذات کی کٹھالی میں ڈال کر اور اپنی خودی کے تیزاب کا چھینٹا دے کر اس کے کھرے کھوٹے کا تجزیہ کرتے تھے۔[22]

تجربہ، باطنی صداقت اور اخلاقی اقدار کی پختگی

سلیم احمد کا پختہ یقین تھا کہ اپنے تجربے کی حقیقت کو تسلیم کیے بغیر ہم باطنی صداقت حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ عسکری صاحب کی طرح سمجھتے ہیں کہ ایک سچے ادیب کی ذمّہ داری ہے کہ وہ اپنی باطنی صداقت اور اخلاقی اقدار پہلے اپنے تجربے میں پختہ کرے اگر اس کا دل اس بات کو تسلیم کرتا ہے تو اس کا اظہار بھی پوری دیانت داری سے کرے اور اگر اسلام کے کسی رکن پر وہ ایمان نہیں لا سکا تو منافقت کا راستہ اختیار کیے بغیر اپنی دلی کیفیات اور تجربے کو ادب کا حصہ بنائے، اور ان وجوہات کا ذکر ضروری ہے جو اسے کسی بات کے ماننے کے لیے مانع ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر انسان کی سوچ کا زاویہ نگاہ مختلف ہو سکتا ہے۔ قیام پاکستان کے آغاز میں ہی جب عسکری صاحب اور سلیم احمد صاحب پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کے تعین، تشخص اور تحفظ کے لیے اپنی مقدور بھر کوششوں میں مصروف تھے، وہاں بہت سے ادیبوں کے لیے مسلم لیگ نے پاکستان بنانے کے لیے جو نعرے لگائے تھے یا مسلم عوام سے جو وعدے کیے گئے تھے ان کی اہمیت محض وقتی تھی اور اب ان کو اپنی ضرورت پورا کرنے کے بعد تاریخ کا حصہ بن جانا چاہیے مطلب ہمیں یہ سب بھول کر آگے بڑھنا ہوگا۔ یہ باتیں آغاز میں ن م راشد صاحب نے کیں جسے سلیم احمد رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اس نقطہ نظر کو آگے بڑھایا جائے تو پاکستان کی تعریف، اس کی معنویت، محرکات تخلیق اور مقاصدِ تخلیق سب مشتبہ ہو جاتے ہیں اور پاکستان کی تعریف و تعبیر میں اقبال، قائد اعظم اور مسلم لیگ سب کے نظریات کی اہمیت صرف تاریخی اور وقتی رہ جاتی ہے۔ تو پھر پاکستان کی تعبیر کون کرے گا؟ پاکستان کے معنی کون بتائے گا؟ پاکستان کے مستقبل کی صورت گری میں ہم کس کی رہنمائی قبول کریں گے؟ معاف کیجیے گا مجھے بہر حال قائد اعظم، ن م راشد سے زیادہ عزیز ہیں۔ اور ان کی باتیں کتنی ہی وقتی کیوں نہ ہوں راشد صاحب جیسوں کی ابن الوقتی سے بہت زیادہ معنی رکھتی ہیں۔[23]

خلاصہ بحث

سلیم احمد قیام پاکستان کے ساتھ ہی اپنی بھرپور سعی سے پاکستان میں اسلامی کلچر کے فروغ کے لیے کوشاں رہے ہیں، وہ اپنے پیش رو محمد حسن عسکری کی طرح پر اعتماد ہیں کہ اس نوزائیدہ مملکت میں ہمیں علاقائی اور صوبائی تعصب سے بالاتر ہو کر وسیع تناظر میں ہند اسلامی کلچر کو اپنانا ہوگا۔ یہاں کے کلچر کو ایک آفاقی رنگ میں رنگ کر ہم پاکستان کی تہذیب و ثقافت کو عالمی اسلامی تہذیب میں ڈھال سکتے ہیں، اور یہی پاکستانی کلچر ہی عالم اسلام کے لیے قابلِ قبول اور ہم آہنگی کا سبب بن سکتا ہے، جسے ہم بجا طور عالمی اسلامی کلچر کہہ سکتے ہیں۔ سلیم احمد کے تمام تصورات و نظریات پر محمد حسن عسکری کے تصورات کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے، تاہم وہ اپنا الگ تشخص قائم کرنے میں بھی کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔

---

[22] جمال پانی پتی، مضامین سلیم احمد، ، سرورق۔

[23] جمال پانی پتی، مضامین سلیم احمد، 838۔